مذہبی اقلیتیں اور پاکستان کا آئین

پیٹر جیکب

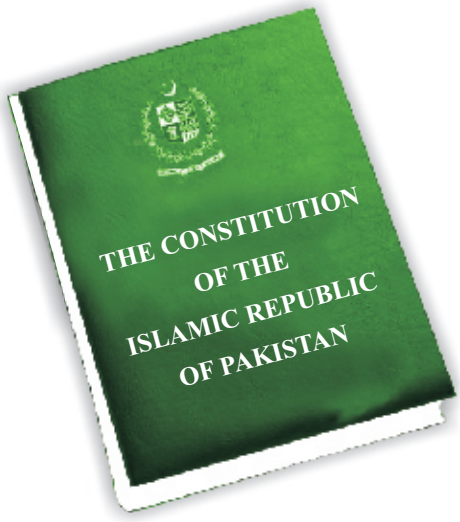

آئین پاکستان (1973ء) پر بات کرتے ہوئے کئی مرتبہ دو انتہائی متضاد نکتہ نظر سامنے آجاتے ہیں ایک نکتہ نظر کے حامی احباب یہ کہتے ہیں کہ آئین چونکہ حقوق کے تحفظ کا کما حقہ حق ادا نہیں کرتا لہذا مذہبی امتیاز (آرٹیکل 41[1](2) اور 91[2](3) وغیرہ) کے ناطے دو طرح کے شہری (مسلم اور غیر مسلم) تشکیل کرتا ہے اسلئے موجودہ حالت میں قابل قبول نہیں۔ دوسرے نکتہ نظر کے حامی احباب کا موقف ہے کہ جب تک آئینی فریم ورک کے اندر تبدیلی نہیں کی جاتی تب تک آئین کے اندر موجود تحفظ کو بہتر تشریح اور اطلاق کے ذریعے کسی حد تک حقوق کے دفاع کا کام لیا جاسکتا ہے۔ یوں دوسرے نکتہ نظر کے مطابق آئین موجودہ حالت میں اتنا بھی کمزور نہیں۔ پہلا نکتہ نظر مثالیت پسندی کے رجحان کا آئینہ دار ہے تو دوسرے نکتہ نظر کو عملیت پسندی کی ایک بہترین مثال کہا جاسکتا ہے۔

درحقیقت کسی ایک کو بھی نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس بات کی خواہش رکھنا کہ پاکستان کا آئین ایک مثالی آئین (آئیڈیل) ہو بذات خود بہت عمدہ بات ہے یہ بھی درست ہے کہ جب تک یہ آئین نافذ ہے تب تک ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا مناسب نہیں ہوگا اس دلیل میں بھی وزن ہے۔ دیکھا جائے تو دونوں حقائق سامنے رکھنے سے ہی تو تصویر مکمل ہوتی ہے۔

مشہور مقدمہ ظفر علی شاہ بنام پرویز مشرف (PLD2000 SC 869) جس میں سپریم کورٹ نے پرویز مشرف کے تختہ الٹنے کے اقدام پر فیصلہ میں نہ صرف اقدام کو جائز قرار دیا تھا بلکہ آئین کے "بنیادی ڈھانچے" کو چھیڑے بغیر اس میں تبدیلی کا اختیار بھی دے دیا۔ پھر ایک بار 2017ء میں سابق وزیر قانون انور خالد نے ایک مقدمے میں مندرجہ بالا کیس کا حوالہ دیتے ہوئے دو اہم نکات عدالت کے سامنے رکھے:۔

1۔ آئین کا "بنیادی ڈھانچہ" کیا ہے اس سوال کا آئین میں کوئی جواب نہیں بلکہ یہ کہ "بنیادی ڈھانچہ" کی اصطلاح ایک پڑوسی ملک کے آئین سے مستعار لی گئی ہے۔ قانونی اصطلاحات مستعار لینے میں تو خرابی نہیں لیکن اسکا ذکر جب آئین میں موجود ہی نہیں تو کسی عدالتی حکم پر عمل درآمد کیسے ہوسکتا ہے یا کیسے ممکن تھا؟

2۔ انور خالد نے کہا کہ آئین پاکستان ایک کمزور قانونی دستاویز ہے اور وجہ یہ ہے کہ اس میں مختلف ماڈلز (اسلام، سوشلزم اور جمہوریت) کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی اور اس وجہ سے آئین پاکستان حقوق اور جمہوریت کا دفاع کرنے یعنی سیاسی نظام کو استحکام دلانے میں معاون ثابت نہیں ہوا۔

عدالتی کارروائی کی مندرجہ بالا بحث کو سامنے رکھیں تو سمجھنا آسان ہے کہ آئین یعنی قانون کی حکمرانی کا احترام اپنی جگہ مگر آئین کے علمی پہلوؤں اور عصری تقاضوں کا جائزہ لینا بھی عام بات ہے۔ آئین شناس ماہرین ہوں یا حقوق کا استعمال کرنے والے عام شہری، آئین کے محاسن پر بحث معمول کی بات ہے۔

1۔ آرٹیکل 41(2) کوئی شخص اس وقت تک صدر کی حیثیت سے انتخاب کا اہل نہیں ہوگا تاوقتیکہ وہ کم از کم پینتالیس سال کی عمر کا مسلمان نہ ہو اور قومی اسمبلی کا رکن منتخب ہونے کا اہل نہ ہو۔

2۔ آرٹیکل 91(3) اسپیکر اور ڈپٹی اسپیکر کے الیکشن کے بعد، قومی اسمبلی، کسی بھی دوسری کارروائی کو چھوڑ کر، کسی بحث کے بغیر، اپنے مسلم اراکین میں سے ایک کا وزیراعظم کے طور پر انتخاب کرے گی۔

آئین پاکستان میں اقلیتوں کے حوالہ سے اہم پہلو ذیل میں پیش خدمت ہیں۔

1۔ دنیا کی کئی آئینی دستاویزات کے برعکس پاکستان کے آئین میں صرف مذہبی اقلیتوں کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہے۔ نسلی، لسانی، قومیتی اقلیتوں وغیرہ کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ جس سے عملاً قانون کی توجہ مذہبی اقلیت پر مرکوز ہو جاتی ہے اور باقی اقلیتوں کے حقوق نظر انداز ہوتے ہیں۔

2۔ "اقلیت" کی اصطلاح آئین کے آدرشی حصہ (آرٹیکل 36[3] اور پالیسی اصول باب دوئم) میں استعمال کی گئی جبکہ آئین کے تشکیلی حصہ جس میں ریاستی نظام وضع ہوتا ہے اس میں لفظ غیر مسلم استعمال کیا گیا ہے خاص طور پر آرٹیکل 260[4] میں جہاں آٹھ مذہبی شناختوں (ہندو، شیڈیولڈ کاسٹ، مسیحی، سکھ، پارسی، بدھ، بہائی اور احمدی) کو غیر مسلم شمار کیا گیا ہے۔ اقلیت کی اصطلاح تو دنیا بھر میں استعمال ہوتی ہے جو تاریخی اعتبار سے قدرے نئی ہے لیکن مغربی زبانوں میں اس کا قانونی مفہوم موجود ہے۔ اس سے پیشتر غیر مسیحی، غیر کا تھولک او غیر مسلم کی اصطلاحات صرف ابلاغ کا حصہ رہی ہیں البتہ اب پاکستان کے آئین میں پائی جاتی ہے اور اس کے مقصد، مفہوم اور اثرات تینوں میں ابہام کے ساتھ منفی نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ غیر مسلم جو ایک منفی شناخت ہے کچھ احباب تو اس اصطلاح کو بغیر غور و فکر کے اقلیت کی اصطلاح پر ترجیح دینے لگے ہیں۔

3۔ بادی النظر میں آئین میں کم از کم 25 دفعات (آرٹیکل) ایسی ہیں جن میں مذہب کی بنیاد پر اکثریتی آبادی یا مذہب کے بارے میں ترجیحی رویئے کا ثبوت ملتا ہے۔ جو کسی آئین یا قانون کے لیے صحت مند بات نہیں۔ قانون کی حکمرانی کا رواج تشکیل دینے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ قانون مساوی اور منصفانہ ہو اگر قانون شہریوں میں اونچ نیچ/امتیاز کا معیار اپنائے تو قانون جلد یا بدیر اپنی غائیت اور وقار سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس لئے ایسی دفعات کو تبدیل کرنا ضروری ہے جو شہریوں میں کسی کے حقوق کم اور کسی کے زیادہ کرنے کا جواز مہیا کریں ورنہ کسی حبیب جالب کو یہ کہنا پڑے گا کہ

ایسے دستور کو، صبح بے نور کو -- میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا

4۔ 19 جون 2014ء کو سپریم کورٹ کے معروف فیصلے میں چیف جسٹس تصدق حسین جیلانی نے مذہبی آزادی کی تشریح کر دی کہ (آرٹیکل 20[5]) بلا تخصیص مذہب ہر شہری کو یکساں حقوق مہیا کرتا ہے نیز ہر شخص کی مذہبی آزادی کی حدود کا تعین صرف قانون میں دی گئی پابندیوں اور اسکے اپنے عقائد کی روشنی میں ہوگا۔ یعنی محض اکثریتی مذہب کی روشنی میں ان آزادیوں کی تشریح نہیں ہوگی۔

لہذا یہ بات واضح ہے کہ آئین میں کچھ حقوق خصوصاً سیاسی نوعیت کے حقوق میں مذہبی بنیاد پر تخصیص یا تفریق پائی جاتی ہے (مثلاً صدر اور وزیر اعظم کا انتخاب) یہ بھی درست کہ آئین کی تمہید یعنی قرارداد مقاصد سے لے کر اراکین اسمبلی کے حلف تک، اکثریتی مذہب کی ترجیح کے کئی نمونے پائے جاتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف اکثر و بیشتر بنیادی حقوق اور آزادیاں تمام شہریوں کے لیے یکساں ہیں اگر کہیں نفاذ اور اطلاق میں کوئی سقم پایا جاتا ہے تو وہ اطلاق کی کمزوری ہے نہ کہ آئین کی۔

اس بحث سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ دستورِ پاکستان کی کمزوری اپنی جگہ لیکن جہاں اچھی بری سب ملا کے 25 مرتبہ ترامیم ہو چکی ہیں وہاں خیر کی توقع رکھنی چاہیے۔

جہاں تک معصیت ہے ارتقا کا در کھلا ہے (محمد انور)

3۔ آرٹیکل 36 مملکت، اقلیتوں کے جائز حقوق اور مفادات کا، جن میں وفاقی اور صوبائی ملازمتوں میں ان کی مناسب نمائندگی شامل ہے، تحفظ کرے گی۔

4۔ آرٹیکل 260 (ب) "غیر مسلم" سے مراد کوئی ایسا شخص مراد ہے جو مسلم نہ ہو اور اس میں عیسائی، ہندو، سکھ، بدھ یا پارسی فرقے سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص، قادیانی گروپ یا لاہوری گروپ کا (جو خود کو "احمدی" یا کسی اور نام سے موسوم کرتے ہیں) کوئی شخص یا کوئی بہائی، اور جدولی ذاتوں میں سے کسی سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص ہے۔

5۔ آرٹیکل 20 (الف) ہر شہری کو اپنے مذہب کی پیروی کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا حق ہوگا اور

(ب) ہر مذہبی گروہ اور اس کے ہر فرقے کو اپنے مذہبی ادارے قائم کرنے، برقرار ان کا انتظام کرنے کا حق ہوگا

گزشتہ سے پیوستہ

الف اقلیت سے ع عقلیت تک: لفظ او اور معنی کا سفر

کچھ عرصہ سے یہ سوال اُٹھایا جا رہا ہے کہ پاکستان میں بسنے والے ہندو، مسیحی، سکھ، پارسی، بدھ مت اور تعداد میں تھوڑی دیگر برادریوں کے لئے اقلیت کی اصطلاح کا استعمال موزوں ہے یا نہیں؟ کیونکہ کبھی کوئی سیاست دان بیان دیتا ہے کہ جمہوریت میں اقلیت اکثریت نہیں ہوتی تو کبھی کسی کو یہ الجھن ستا رہی ہوتی ہے کہ لفظ اقلیت ابھی تک ڈکشنری کا حصہ کیوں ہے۔

بجا کہ جمہوری نظام میں شہریوں کا درجہ ایک جیسا اور برابر ہونا چاہیے اور یہ بھی تسلیم کہ لفظ اقلیت کی مخالفت کرنے والے احباب کے سامنے مقصد مساوی حقوق کی منزل کا حصول ہوگا۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ علمی اور عملی اعتبار سے کیا بہتر ہے، دلیل کا وزن کس پلڑے میں جبکہ حقائق کیا کہتے ہیں۔ تا کہ علم تو ہو کہ کیا واقعی لفظ اقلیت کو استعمال کرنے سے جمہوریت کا تصور مجروح ہوتا ہے؟

اردو اور پاکستان کی دیگر زبانوں میں استعمال کردہ لفظ "اقلیت" عربی زبان سے وارد ہوا جس سے مراد قلیل یا تھوڑا ہوتا ہے۔ اسکا انگلش متبادل لفظ مائینارٹی بھی، تھوڑے، کم سن اور کم تعداد کے معنی بیان کرتا ہے۔

مثلاً اگر ایک کمرے میں دس افراد بیٹھے ہوں جن میں سے چار نے سر پر ٹوپی پہن رکھی ہو، تین اردو بولنے والے ہوں اور دو ذیابیطس کنٹرول کرنے کی دوا استعما ل کرتے ہوں۔ تو یہ سب ایک یا دوسرے اعتبار سے اقلیت ہیں۔ مگر انکے اقلیت شمار ہونے سے بحیثیت انسان انکی قدر و قیمت میں کمی یا اضافہ نہیں ہوتا۔ لیکن انکی ضروریات کے تعین میں آسانی ہوسکتی ہے۔ دنیا بھر میں، ہر روز ایسے اشاریوں کی مدد سے سینکڑوں سروے، جائزے اور اعداد و شمار اکٹھے کئے جاتے ہیں جن سے معاشی و معاشرتی تخمینے لگائے اور منصوبے بنائے جاتے ہیں۔

1940 میں قیامِ پاکستان کی بنیاد بننے والی قراردادِ لاہور اقلیتوں کی غیر مشروط، موثر، نتیجہ خیز نمائندگی اور حقوق پر زور دیتی ہے۔ یہ الگ بات کہ بعد ازاں قراردادِ مقاصد تو قراردادِ لاہور کے مقصد کو شکستہ پا کرنے کی کوشش تھی۔

آئینِ پاکستان کے آرٹیکل 260 پر یہ اعتراض بھی بجا کہ ریاست یا قانون کو شہریوں کے مذہب کا تعین نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ چناؤ ہر فرد کا انفرادی حق ہے لیکن اس چناؤ کے بعد شہریوں میں مساوی حیثیت قائم کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ جس کا اشارہ آئین کے آرٹیکل 36 میں ملتا ہے جو اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ سے تعلق رکھتی ہے۔

1992 میں اقوامِ متحدہ نے قومیت، زبان، نسل اور مذہب کی بنیاد پر دنیا بھر میں پائی جانے والی اقلیتوں کے حقوق پر ایک ڈکلیئریشن پاس کیا۔ 1999 سے 2006 تک اقوامِ متحدہ کے انسانی حقوق کمیشن کے ساتھ ایک ذیلی کمیشن کام کرتا رہا۔ جس کا کام دنیا بھر کی اقلیتوں کے ضمن میں اصول و ضوابط کے ذریعے حقوق کا موثر نفاذ تھا۔ اقلیتوں کے مسائل پر اقوامِ متحدہ کے خصوصی مبصر کا تقرر بھی ہو چکا ہے۔

ان انتظامات سے پتہ چلتا ہے کہ مذہب یا دیگر شناختوں کی بنیاد پر ایسے شہری یا افراد جو تعداد میں کم ہیں ان کے حقوق کے تحفظ کی ضرورت نہ صرف پاکستان بلکہ دیگر ممالک میں بھی محسوس کی جاتی ہے۔ لہذا ملکی اور بین الاقوامی قوانین میں اقلیت کی اصطلاح عام استعمال ہو رہی ہے اور کیسے نہ ہوتی کیونکہ دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں پر انسانی معاشرت یکسانیت کا نقشہ پیش کرتی ہو بلکہ دنیا میں مختلف زبانیں بولنے والے مختلف مذاہب اور نسلوں کی رنگا رنگی ہی تو انسانی ثقافت اور تمدن کا حُسن ہے۔

اسی لئے دنیا کے بیشتر ممالک کے قوانین اور سیاسی بندوبست میں اقلیتوں کو قومی زندگی اور دھارے میں شامل کرنے ،انکے سیاسی سماجی ،معاشی اور ثقافتی حقوق کے تحفظ کے لئے خصوصی اقدامات کئے جاتے ہیں جن میں اعداد وشمار جمع کرنے سے لے کر، زندگی کے تمام شعبوں میں اقلیتوں کی موثر نمائندگی کے لئے قانون، ضابطے اور نظام وضع کرنے شامل ہیں۔

اقلیتوں کے وجود کو تسلیم کرنے کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اپنی مذہبی یا دیگر شناختوں کی بناء پر کسی محرومی یا احساسِ کمتری کا شکار نہ ہوں۔ بلکہ تعداد میں کم ہونے کی وجہ سے اگر انکے ساتھ کسی قسم کی نا انصافی ہو رہی ہے تو اسکا تدارک کیا جا سکے۔غور طلب بات یہ ہے کہ اکہری یا singular شناخت پر اصرار تو جمہوریت اور جمہوری اقدار کی نفی ہے۔

درحقیقت کسی انسان کا کثیر الشناخت ہونا فطری اور نارمل ہے۔فرد ایک وقت میں کسی ملک کا شہری، مذہب کا پیروکار اور کسی خاص میوزک کا رسیا بھی ہو تو اسکا ان تمام شناختوں کے اعتبار سے منفرد ہونا سماج کے لئے قابلِ قبول ہونا چاہئے۔لہذا ثابت ہوا کہ لفظ اقلیت سماج یا آئین میں کسی نابرابری کا محرک تو شاید بالکل بھی نہیں لیکن سماج میں پائے جانے والی نابرابری کا اقرار ضرور ہے۔

مذہب عقیدہ اور دیگر کسی بنیاد پر انسانوں میں تعصب ،امتیاز ،نفرت کے جذبات اور بیگانگی منفی چیزیں ہیں۔ ہر وہ روّیہ، قانون اور رواج جو کسی بھی بہانے انسانوں میں اونچ نیچ کو روا رکھے اُسکا علاج ضروری ہے نا کہ عددّی حقیقت کو فراموش کرنا اور تنوع سے انکار۔

پاکستان میں مذہبی اقلیتوں کے ضمن میں بہتر تو یہ ہے کہ انکی پاکستانی شناخت کے ساتھ ساتھ انکی مذہبی شناختوں یعنی ہندو، مسیحی، سکھ وغیرہ کو من جملہ لکھا پڑھا اور ادا کیا جائے۔

لیکن بادی النظر میں انہیں مذہبی اقلیتیں کہنا نا مناسب نہیں۔اقلیتوں کے وجود سے انکار کی بجائے انکی مذہبی ،لسانی، نسلی اور قومیتی شناختوں کو تسلیم کر کے حقوق کی مساوات اور حقوق کے تحفظ و نفاذ کا کام بہتر طور پر کیا جا سکتا ہے۔

خیال امروہی نے کہا تھا۔

اے دوست ذرا اور قریبِ رگ جاں ہو
کیا جانے کہاں تک شبِ ہجراں کا دھواں ہو
شاید یہ مری آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو
احباب کی کھوئی ہوئی منزل کا نشاں ہو

ادارہ برائے سماجی انصاف کے اس پیغام کو اپنے دوستوں سے share کیجئے اور آپ اپنی رائے کا اظہار اس ای میل پر کر سکتے ہیں **pj@csjpak.org**

CENTRE FOR SOCIAL JUSTICE

www.csjpak.org

Centre for Social Justice
@csjpak
csjpak@gmail.com